قسم کا خوف اور غم نہ ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے اندر جنت" (جو دنیا سے کہیں عالی مقام ہے) میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے[1] اور جنہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ شیطان کی دشمنی کے شکار ہو گئے تو وہ دوزخ میں جائیں گے جہاں انھیں غفلت شعاری اور عافیت کوشی کی سزا ملے گی۔ فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون والذین کفروا وکذبوا بایتنا اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون ۲/۳۹

تمام پیغمبروں نے قومی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی اسی بنا پر ان کی تعلیم میں اختلاف نظر آتا ہے ورنہ سب کی تعلیم یکساں تھی اور سب نے قوم کو عملِ صالح کی طرف بلایا

الغرض اس قدر اہتمام و انتظام کے بعد یہ حضرت انسان دنیا میں اپنے عہدہ پر مامور ہوئے۔ کچھ دنوں تک مذکورہ ہدایتوں پر قائم رہے پھر ان میں تبدیلیاں شروع ہوئیں تبدیلیوں کی بنیاد وہی شیطان دشمنی تھی جس سے پہلے آگاہ کیا جا چکا تھا حسب وعدہ اللہ نے اپنے رسولوں اور ہدایتوں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ یہ لوگ تعلیم کے ذریعہ اس کا اصلی مقام واپس دلائیں اور مخالف طاقتوں کے غلبہ کی وجہ سے جو صلاحیت کو زنگ لگ گیا ہے تربیت کے ذریعہ اس کو دور کریں۔

یہ مقدس ہستیاں مختلف وقتوں میں مختلف مقامات پر مذکورہ غرض کے ماتحت آتی رہیں اور زندگی کے جس پہلو میں کمزوری زیادہ سرایت کی ہوئی تھی اسی کو اپنی تعلیم و تربیت میں زیادہ نمایاں مقام دیتی رہیں، مثال کے طور پر کوئی قوم دنیاداری میں حد سے زیادہ ڈوب کر عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئی تھی تو اعتدال کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دنیا کی بے ثباتی کی طرف زیادہ توجہ دلائی، کوئی قوم تشدد اور سختی کی طرف زیادہ مائل تھی تو نرمی پر زیادہ زور دیا وغیرہ۔

(نفسیات کے ماہرین اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ سماجی زندگی کی اصلاح کے سلسلہ میں کہاں کس طرح اور کس حد تک زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت ہے کہ اس میں اعتدال کی

---

[1] تفسیر عزیزی مقدمہ سورۃ الفطار

کیفیت پیدا ہو دراصل یہی اعتدالی کیفیت عملِ صالح کی روح رواں ہے۔[1]

رسول اللہ تعلیم وتربیت کا جامع نظام لے کر تشریف لائے جس میں حالات کے لحاظ سے مختلف طریقے اور مختلف تدبیریں ہیں۔

یہاں تک کہ اللہ نے داعیِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری رسول بنا کر بھیجا اور تعلیم وتربیت کا جامع نظام آپ کے سپرد کیا جس میں موقع ومحل اور زمانہ کے لحاظ سے سماجی زندگی کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے اور مختلف تدبیریں مذکور ہیں چنانچہ جن لوگوں نے قرآن اور سیرت کا مطالعہ سماج کی اصلاح اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح

---

[1] اسی اعتدال کی کیفیت پیدا کرنے کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں بعض احکام سخت ملتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں بظاہر رہبانیت کا شبہ ہوتا ہے مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا اور دولت سے بے رغبتی کی سخت تاکید فرمائی اور یہودیوں کی انتہائی سخت دلی کے پیش نظر فرمایا کہ اگر "کوئی تمہارے ایک گال میں طمانچہ مارے تو تم اس کے سامنے اپنا دوسرا گال پیش کر دو۔" اور اگر کوئی بے گار میں پکڑ کر تمہیں ایک میل لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ۔" اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے حلت اور حرمت کے بارے میں سخت احکام صادر فرمائے اور پابندیوں اور بندشوں کے سلسلہ میں بتدریج ان کے یہاں سختی کا ذکر ملتا ہے یہ سب کچھ قومی زندگی میں عملِ صالح کی روح پیدا کرنے کے لئے تھا۔

اس مقام کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کیوں کہ جب کبھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا دوسرں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو بالعموم اسی قسم کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور اصل حقیقت نہ سمجھنے کی بنا پر در پردہ ان مقدس ہستیوں کی توہین ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد "روسو" کا یہ قول قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ "حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں ایک روحانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تشریف لائے جس نے مذہبی اور سیاسی نظام کو جدا کر کے ریاست کی وحدت منادی اور اندرونی تفرقے پیدا کر دئے جنہوں نے عیسائی اقوام کو کبھی چین نہ لینے دیا۔" (ملاحظہ ہو معاہدۂ عمرانی ص۲۳۸)

دراصل عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں دین اور دنیا مذہب اور سیاست کی کوئی تفریق نہ تھی بعد میں ان کے ماننے والوں نے تفریق پیدا کی اس بنا پر الزام حضرت عیسیٰؑ پر نہیں بلکہ ان کے ماننے والوں پر ہے۔

اس بارے میں "ڈاکٹر جوزلف ہیل" کی تحقیق زیادہ قابل قدر ہے وہ کہتے ہیں

"انبیاء ورسل اور بانیانِ مذہب نے اپنے زمانے اور اپنی قوم کی تہذیب وتمدن میں حصہ لیا ہے لیکن جو عالمگیر تبدیلیاں اسلام سے براہِ راست نہایت سرعت کے ساتھ مرتب ہوئی ہیں ان کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں ملتی ہے۔" (تمدن عرب ص۲۳)

جیسا کہ بیضاوی نے خلافت آدم کی بحث میں کہا ہے۔

وکذلك کل نبی استخلفهم فی عمارة الارض وسیاسة الناس وتکمیل نفوسهم وتنفیذ امره فیهم

واقف ہیں۔

مثال کے طور پر چند یہ ہیں

(۱) قرآن حکیم میں انفاق اور خرچ کے بارے میں مختلف چیزیں ملتی ہیں کہیں جواب میں کہا گیا ہے "قل العفو" ۲/۲۱۸ (جو کچھ ضرورت سے زائد ہو سب خرچ کر دو) کہیں قرابت داروں یتیم اور مسکین وغیرہ پر خرچ کرنے کی تاکید ہے ۲/۲۱۴ اور کہیں زکوٰۃ کا حکم ہے

اس قسم کی تمام آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری باتیں دراصل حالتوں کے اختلاف کی بنا پر ہیں یعنی یہ بات مُسلّم ہے کہ صالح معاشرہ کے بقاء و قیام کے لئے معیشت کا متوازن ہونا ضروری ہے اب اگر یہ توازن اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کو چھوڑ کر کثیر آمدنی والوں سے سب کچھ لے لیا جائے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی حالت میں "قل العفو" کا حکم ہے اور اگر یہ توازن زکوٰۃ کی مقررہ مقدار سے پیدا ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں اسی پر اکتفا کرنے کا حکم ہے۔

اسی طرح دفاع کا معاملہ درپیش ہے اور مصارفِ جنگ کا سوال ہے اس کے بغیر چارہ نہیں نظر آتا ہے کہ جو کچھ ہے سب اس راہ میں قربان کر دیا جائے تو ایسے نازک موقع پر ذاتی منفعتوں کو نظر انداز کر کے تن من دھن سب کے قربان کر دینے کا حکم ہے۔

قرابت داروں کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے اور خود کے پاس زکوٰۃ کی مقدار نکالنے کے باوجود فاضل سامان موجود ہے تو ایسی حالت میں ہر طرح سے ان کی اعانت کرنا فرض ہے۔

غربت و افلاس اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ طبقاتی کشمکش صرف زکوٰۃ کی مقدار سے نہیں دور ہو سکتی تو سب سے پہلا کام اس کشمکش کو دور کرنا ہے جس طرح بھی ہو۔ غائر نظر ڈالنے سے اس طرح کی بہت سی مثالیں آپ کو مل سکتی ہیں۔

قرآن حکیم نے اچھائیوں کی نشر و اشاعت اور برائیوں سے روکنے کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے سماجی زندگی کے مختلف دور اور مختلف منزلوں کا پتہ چلتا ہے نہ ساری

اچھائیاں یک بیک اس نے مسلط کی ہیں اور نہ ساری برائیوں سے دفعتہً روک دیا ہے بلکہ ۲۳ سال میں سماج کے مزاج اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھ کر سہتے سہتے ایک مکمل نظام پیش کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے جو نئی چیز سامنے آئی لوگوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

آج دنیا کے سامنے شراب کا معاملہ کتنا نازک اور اہم ہے امریکہ نے اس بارے میں ۱۹۳۵ء تک سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور بالآخر اُسے قانون واپس لینا پڑا۔ عربی زبان میں اس کے لیے ڈیڑھ سو کے قریب الفاظ ملتے ہیں جس سے اہلِ عرب کی فریفتگی اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی قرآنِ حکیم نے اس کی ممانعت میں جو طریقہ اختیار کیا وہ قابلِ غور ہے ایک مرتبہ اس نے کہا کہ شراب میں نفع (عارضی سرور) و نقصان دونوں ہیں لیکن نقصان اور برائی اس میں زیادہ ہے۔ ۲/۲۱۹

اس سے یہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ چیزوں کے استعمال میں صرف نفع ہی نہ دیکھنا چاہیے بلکہ نفع اور نقصان دونوں کو تولنا چاہیئے جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اسے ترک کر دینا چاہیئے اگرچہ تھوڑا نفع بھی ہو اور جس چیز میں زیادہ نفع ہو اسے اختیار کرنا چاہیئے اگرچہ اس میں کچھ نقصان کا بھی احتمال ہو ابتداء میں اس کی حیثیت مشورہ کی تھی جس کا مقصد شراب کے نقصان کو ذہن میں بٹھانا تھا اس ابتدائی مرحلہ میں شراب کے اس عارضی نفع کو بھی تسلیم کر لیا جو اُن کے خیال میں تھا کہ اس سے لڑائی لڑنے میں مدد ملتی ہے اور سرور کی خاص کیفیت پیدا ہو کر غم غلط ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس موقع پر کس قدر ان کے جذبات کا لحاظ رکھا پھر دوسری مرتبہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ۴/۴۳ اس سے کم سے کم اتنا تو ہو گیا کہ نماز اور اس کے وقت کے قریب شراب پینے پر پابندی لگ گئی پھر جب ان کی طبیعت ہموار ہو گئی اور مستقل نقصان کی خاطر عارضی نفع کو چھوڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تو شراب پر دائمی پابندی کا حکم آ گیا اور اس شد و مد کے ساتھ کہ "رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ۵/۹۰" یہ شیطانی حرکتوں کی گندگی ہے تم اس سے پرہیز کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

راوی کا بیان ہے کہ جس دن دربارِ نبوت کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا ہے مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب بہہ رہی تھی اور جو جس حالت میں شراب لئے ہوئے تھا اسی حالت میں اس نے پھینک دی حتیٰ کہ جام ...

[illegible]

یہ تھی شارع علیہ السلام کی پیشین گوئی کہ

"اِنَّ اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"

(۳) امام اشعری نے اسلامی فکر کے دھارے کا رُخ غلط جہت سے ہٹا کر صحیح اسلامی جہت کی طرف موڑ دیا۔ لیکن پوری صدی کا امتدادِ زمانی بہت ہوتا ہے۔ جاہلی طاقتیں اسلامی سماج پر دوسرے رخنوں سے حملہ آور ہوئیں۔ امام اشعری نے ۳۲۳ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد ہی قلمروئے اسلامیہ میں ایک انقلابِ عظیم آیا ۳۳۴ھ میں دربارِ خلافت پر آل بویہ کا تسلط ہو گیا۔ بویہی تسلط عجمی جاہلیت کا بدترین نمونہ تھا اور اس نے بہت جلد پورے اسلامی سماج کو مسموم کر دیا۔ بدعتوں کا زور ہوا، ہزیمت خوردہ عجمیت کو دل کھول کر اسلام سے انتقام لینے کا موقعہ ملا۔ معتزلہ کی بدعتِ قدیمہ اور بویہیوں کے کینہ آمیز رفض نے مل کر الحاد و بے دینی کی ایک عجیب معجون مرکب پیدا کی اور مصیبت یہ ہوئی کہ یہ بے دینی عوام و خواص دونوں میں پھیلنا شروع ہوئی۔ جاہلیت کا یہاں تک غلبہ ہوا کہ دین متین کے انصار یعنی علمار اہل سنت گوشۂ عزلت میں مختفی ہو گئے۔ عوام طریقِ سنت سے ناآشنائے محض تھے۔ اور امرار کی مجالسِ علمیہ میں اہلِ سنت والجماعت کے مسلکِ قدیم کو بچشم اِزدرار دیکھا جاتا تھا۔ ہر طرف رفض و اعتزال کا دور دورا تھا۔ حافظ ابن عساکر نے اس فاسد سماج کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

وکانت شوکۃ المعتزلۃ بالعراق	معتزلہ کا اثر و رسوخ عراق میں بہت زیادہ تھا
شدیدۃ الی ان کان زمن الملک	یہاں تک کہ بادشاہ پناہ خسرو کا زمانہ آیا وہ علم
فناخسرہ وکان ملکا یحب العلم	اور علمار سے محبت رکھتا تھا اور اس کے یہاں
والعلماء وکانت لہ مجالس یعقد	علمار اور اُن کے باہمی مناظرات کے لئے جلسے
فیھا للعلماء ومناظرتھم وکان	ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کا قاضی القضاۃ اس
قاضی القضاۃ فی وقتہ معتزلیاً	زمانے میں معتزلی تھا۔ ایک دن پناہ خسرو نے
فقال لہ فناخسرہ یوما:۔ ھذا	اس سے کہا، یہ جلسے علمار سے معمور رہتے ہیں

المجلس عامۃ من العلماء الا انا لا
اری احدا من اھل سنۃ والاثبات
ینصو مذھبہ فقال لہ :- ان
ھؤلاء القوم عامۃ رعاع اصحاب
تقلید ولخبار وروایات یروون
الخبر وضدہ ویعتقدونہما
احدھما ناسخ المتاخی اومتاول
ولا اعرف منھم احدا یقوم بھذا
الامر ... وھذا الفاسق انما
اراد اطفاء نور الحق
(تبیین کذب المفتری ص۱۲۱)

لیکن میں اہلِ سنت میں سے کسی کو نہیں دیکھتا
جو یہاں اپنے مذہب کی تائید و نصرت کرتا ہو۔
قاضی نے جواب دیا یہ لوگ عام بے وقوفوں
میں سے ہیں تقلید و روایتِ حدیث ان کا کام
ہے۔ متضاد احادیث روایت کرتے ہیں اور
ان پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں ایک اُن میں سے
دوسری کی ناسخ ہوتی ہے یا مؤول۔ مجھے تو اُن
میں کوئی ایسا شخص نہیں معلوم جو اس امرِ خطیر
کو انجام دے سکے (اس علمی مجلس میں اپنے
مسلک کی تائید و حمایت کرسکے) لیکن واقعہ
یہ ہے کہ اس فاسق نے حق کی روشنی کو بجھانا چاہا تھا۔

لیکن بادشاہ کو اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی اور اُس نے علمارِ اہلِ سنت کی تلاش پر اصرار کیا تو معلوم ہوا کہ بصرے میں دو عالم ہیں ایک بوڑھا (ابو الحسن الباہلیؒ) اور دوسرا جوان (قاضی ابو بکر الباقلانیؒ) بادشاہ نے شیراز سے جو اس کا پایۂ تخت تھا انھیں بلا بھیجا لیکن امام ابو الحسن الباہلیؒ کے زہد و تقویٰ نے انھیں جانے کی اجازت نہ دی، البتہ امام باقلانی نے محض نصرتِ دین و اعانتِ سنت کی خاطر شیراز جانے کا ارادہ کرلیا اور وہاں جاکر برسرِ دربارِ عام معتزلہ کو شکست دی اور اس طرح سنت کے جھنڈے کو بلند کیا۔ خود بادشاہ اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کو قاضی باقلانی کے سپرد کیا کہ وہ اسے مذہب اہلِ سنت کی تعلیم دیں اور قاضی باقلانی نے اس کے واسطے کتاب "التمہید" تصنیف کی" انھی کی نصرتِ دین کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فکر کے دھارے کا رُخ بدعت و ضلالت اور کفر و جہالت سے مُڑ کر اسلام و سنت کی جانب منعطف ہوگیا۔ اُن کی عظمتِ شان اور جلالتِ قدر کے متعلق ابو عبداللہ صیرفی کہتے ہیں۔

"کان صلاح القاضی اکثر من علمه وما نفع الله هذه الامة بکتبه وبثها فیهم الا لحسن سریرته ونیته واحتسابه ذالك عند ربه"

قاضی ابوبکر باقلانی کا صلاح وتقویٰ ان کے علم وفضل سے زیادہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو اُن کی کتابوں سے اس امت کو فائدہ پہنچایا اور اُس میں اُن کتابوں کی نشر واشاعت ہوئی اُس کی وجہ وجیہہ قاضی باقلانی کی نیک نیتی اور اُن کا محاسبہ عندالرب کا عقیدہ تھی (تبیین)

دوسرے بزرگ کا قول ہے۔

وکان حصناً من حصون المسلمین وما سر اهل البدعة بشیئ کسرورهم بموته"

قاضی ابوبکر باقلانی مسلمانوں کے محفوظ قلعوں میں سے ایک قلعہ تھا تھے اور اہلِ بدعت کو کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اُن کی موت سے۔ (تبیین کذب المفتری)

لیکن امام باقلانی نے اپنی مساعی جمیلہ سے اسلامی سماج کی کہاں تک اصلاح کی اور اسلامی فکر کے دھارے کو صحیح سمت میں موڑنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کے لئے انھیں بزرگ کا قول پڑھیے کہ

وما سر اهل البدعة بشیئ کسرورهم بموته رحمة الله علیه ورضوانه الا انه خلف بعده من تلامیذه جماعة کثیرة تفرقوا فی البلاد، اکثرهم بالعراق وخراسان ونزل منهم الی المغرب رجلان اسدهما ابوعبد الله الازدی رضی الله عنه وبه انتفع اهل قیروان وترك بها من تلامیذه

اہلِ بدعت کو کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا کہ اُن کی موت سے، اللہ کی رحمت ورضوان اُن پر نازل ہو مگر انھوں نے اپنے پیچھے اپنے تلامذہ کی کثیر جماعت چھوڑی جو مختلف شہروں میں پھیل گئی زیادہ تر عراق وخراسان میں اُن میں سے دو شخص مغرب میں پہنچے ایک ابوعبداللہ الازدی رضی اللہ عنہ اور اُن سے اہل قیروان نے بہت زیادہ استفادہ کیا اور وہاں انھوں نے اپنے صاحبِ علم وفضل شاگردوں کی ایک مشہور جماعت چھوڑی..... اور دوسرے

مبرزین مشاهیر جماعة ... ابو طاہر البغدادی ہیں ...... کہ اگر وہ
... والثانی ابو الطاهر البغدادی نہ ہوتے تو مغرب میں علم دین ضائع ہو جاتا۔
...... ولولاه لضاع العلم
بالمغرب (تبیین کذب المفتری)

قاضی ابو بکر باقلانی نے مائۂ رابعہ کے سرے پر ۴۰۳ھ میں وفات پائی اُن کی جلالت قدر خود اُس زمانہ میں اس درجہ مشہور ہو چکی تھی کہ اس وقت کے امام کبیر ابو الفضل تمیمی برہنہ پا ان کے جنازہ کے ہمراہ تھے اور ان کے حکم سے منادی ان کے جنازے کے سامنے کہتا جاتا تھا۔

"هذا ناصر السنة والدين، هذا امام المسلمين، هذا الذی يذب عن الشريعة السنة المخالفين هذا الذی صنف سبعين الف ورقة ردا علی الملحدين"

یہ سنت و دین کا مددگار ہے، یہ مسلمانوں کا امام ہے، یہ وہ ہے جو شریعت پر مخالفین کی دریدہ دہنی کو روکتا تھا، یہ وہ ہے جس نے ملاحدہ کے رد میں ستر ہزار اوراق تصنیف کیے۔ (تبیین ص۲۲۱)

یہ وہ امور ہیں جن سے قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ کا مائۂ رابعہ کا مجدد ملت ہونا مسلم ہوتا ہے۔ اور ان خدماتِ جلیلہ کا پتہ چلتا ہے جن کے ذریعہ انھوں نے اسلامی معاشرہ کی تجدید کی اور اسلامی فکر کے دھارے کا رُخ صحیح سمت میں موڑا۔

قاضی ابو بکر باقلانی چوتھی صدی کے سر پر دنیا سے رخصت ہوئے اور اُن کی ذات سے صادق مصدوق کی اس دیرینہ پیشینگوئی کا ایک مرتبہ پھر تحقق ہوا کہ

"ان الله عزوجل يبعث لهذه الامة على راس كل مائة سنة من يجدد لها دينها"

امام باقلانی کی کوششوں اور اُن کے جانشینوں کی مساعی جمیلہ سے اسلامی سماج کی تجدید ہوئی۔ اسلامی فکر کو ماؤف کرنے والی جاہلی طاقتوں کا استیصال ہوا۔ عوام میں سنت

کی طرف رغبت ہوئی اور سنت بے زار اور اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نفرت۔ اس کا اثر سیاسی حالات پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ بویہی حکومت اور اُس کی اسلام دشمن اور جاہلیت نواز پالیسی سے عوام میں ایک گونہ بیزاری پیدا ہوئی اور نئے انقلاب کے لئے ماحول سازگار ہونے لگا، یہاں تک کہ ۴۴۷ھ میں سلاجقہ نے آل بویہ کا خاتمہ کر کے دربارِ خلافت پر اقتدار حاصل کر لیا۔ آل سلجوق سنّی تھے، اس طرح اسلامی سماج میں طریقِ سنت کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ علماء سنت کو فروغ ہوا۔ مگر سلاجقہ اپنے ساتھ وسط ایشیا کی ملوکیت اور جاگیرداری لے کر آئے تھے اس جاگیردارانہ نظام کے مفاسد "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اسلامی معاشرہ میں خلط ملط ہونے شروع ہوئے۔ امراء میں تجرد رعونت، علماء میں جاہ پرستی اور انانیت اور عوام میں افلاس۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح پر اسلامی سماج اسلامی تھا اور بظاہر سنت کا غلبہ تھا مگر اس کی روح مردہ ہو رہی تھی، للّٰہیت کے بجائے نفسانیت اور آخرت پسندی کی بجائے عقبیٰ فراموشی کا دور دورا بڑھتا جا رہا تھا۔ سماج کے اعماقِ قلب سے ندا بلند ہونی ناگزیر تھی کہ

بس کن زکبر و ناز کہ دیدہ است روزگار　　چنیں قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

خود سماج کے تقاضے ایک خصوصی تعلیم کے لئے دامن گیر تھے جو غیر اسلامی نہیں بلکہ اسلامی ہے، جو رہبانیت سے ماخوذ نہیں بلکہ مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، جو جوگ و اشراق کا ورثہ نہیں بلکہ اصحابِ صفہ کی مقدس یادگار ہے جسے "چنیا بیگم" سے تعبیر کرنا نہ صرف کم سوادی و بے بصیرتی کی دلیل ہے بلکہ مارکس اور لینن کی گمراہ کن سنت کی تقلید اور اس کی مادیت کے ساتھ استرضار کا ثبوت ہے۔ یہ نظامِ فکر جو اس عہد کے قسی القلب اور آخرت فراموش رجحانات کے ردِ عمل اور اصلاح کے لئے فروغ طلب ہوا وہی چیز ہے جسے اسلامیات کی اصطلاح میں "تصوف" کہتے ہیں۔ بہر کیف فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جانب سے یہی صدا آ رہی ہے۔

"اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ"

"وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ، وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ

کیا یہ پیغام ازلی عہد سلجوق کے مومن مگر عقبیٰ فراموش قسی القلب سماج سے زیادہ کسی اور سماج کے تنبہ کے لئے سازگار ہو سکتا ہے؟ کیا یہ غیبی صدا جس نے داؤد طائیؒ کو ایک ڈاکو سے سرتاجِ اولیاء بنا دیا اس سماج کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی جس پر پورا پورا صادق آ رہا تھا۔

"زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذلك متاع الحیوة الدنیا والله عنده حسن المآب"

کیا اس وقت اس منشور الٰہی کے نشر و اعلام کی ضرورت نہ تھی کہ

"انما الحیوة الدنیا لعب ولهو وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم"

کیا تاریخ اسلام کے ادوار میں سے اس دور سے زیادہ کوئی دور اس حقیقت کا مصداق ہو سکتا ہے کہ

"اعلموا انما الحیوة الدنیا لعب ولهو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراه مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرة عذاب شدید۔ ومغفرة من الله ورضوان وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور"

کیا دنیوی دل کشی سے مسحور اس سے زیادہ اور کوئی سماج ہو سکتا تھا جسے اس دنیائے دنی کی لذاتِ فانیہ کے فریب سے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

یا ایها الناس ان وعد الله حق فلا تغرنکم الحیوة الدنیا ولا یغرنکم بالله الغرور

لہٰذا وقت کے برگزیدہ نقیب اور داعی کا فرض تھا کہ وہ پکار کر کہہ دے۔

یا قوم انما هذه الحیوة الدنیا متاع وان الاخرة هی دار القرار

پس اُس نے انھیں مبہم الفاظ میں بتا دیا۔

بل تؤثرون الحیوة الدنیا والاخرة خیر وابقیٰ،

یہ بتانے والا امام غزالی تھا جس نے اسلامی سماج کی پانچویں صدی میں تجدید کی جب کہ معاشرہ میں رفق و لینت کے بجائے قساوت، احتساب باطن کے بجائے ظاہر پرستی، للّٰہیت

کی طرف رغبت ہوئی اور سنت سے بے زاری اور اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نفرت۔ اس کا اثر سیاسی حالات پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ بویہی حکومت اور اُس کی اسلام دشمن اور جاہلیت نواز پالیسی سے عوام میں ایک گونہ بیزاری پیدا ہوئی اور نئے انقلاب کے لئے ماحول سازگار ہونے لگا، یہاں تک کہ ۴۴۷ھ میں سلاجقہ نے آل بویہ کا خاتمہ کر کے دربارِ خلافت پر اقتدار حاصل کر لیا۔ آل سلجوق سنی تھے، اس طرح اسلامی سماج میں طریقِ سنت کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ علماء سنت کو فروغ ہوا۔ مگر سلاجقہ اپنے ساتھ وسط ایشیا کی ملوکیت اور جاگیرداری لے کر آئے تھے اس جاگیردارانہ نظام کے مفاسد "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اسلامی معاشرہ میں خلط ملط ہونے شروع ہوئے۔ امراء میں تجبر و رعونت، علماء میں جاہ پرستی اور انانیت اور عوام میں افلاس۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح پر اسلامی سماج اسلامی تھا اور بظاہر سنت کا غلبہ تھا مگر اس کی روح مردہ ہو رہی تھی، للّٰہیت کے بجائے نفسانیت اور آخرت پسندی کی بجائے عقبیٰ فراموشی کا دور دورا بڑھتا جا رہا تھا۔ سماج کے اعماقِ قلب سے ندا بلند ہونی ناگزیر تھی کہ

بس کن زکبر و ناز کہ دیدہ است روزگار　　چنیں قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

خود سماج کے تقاضے ایک خصوصی تعلیم کے لئے دامن گیر تھے جو غیر اسلامی نہیں بلکہ اسلامی ہے، جو رہبانیت سے ماخوذ نہیں بلکہ مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، جو جوگ و اشراق کا ورثہ نہیں بلکہ اصحابِ صفہ کی مقدس یادگار ہے جسے "چنیا بیگم" سے تعبیر کرنا نہ صرف کم سوادی و بے بصیرتی کی دلیل ہے بلکہ مارکس اور لینن کی گمراہ کن سنت کی تقلید اور اس کی مادیت کے ساتھ استرضار کا ثبوت ہے۔ یہ نظامِ فکر جو اس عہد کے قسی القلب اور آخرت فراموش رجحانات کے ردِ عمل اور اصلاح کے لئے فروغ طلب ہوا وہی چیز ہے جسے اسلامیات کی اصطلاح میں "تصوف" کہتے ہیں۔ بہر کیف فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جانب سے یہی صدا آ رہی ہے۔

"اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ"

"وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ

کیا یہ پیغام ازلی عہد سلجوق کے مومن مگر عقبیٰ فراموش قسی القلب سماج سے زیادہ کسی اور سماج کے تنبہ کے لئے سازگار ہو سکتا ہے؟ کیا یہ غیبی صدا جس نے داؤد طائیؒ کو ایک ڈاکو سے سرتاجِ اولیاء بنا دیا اس سماج کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی جس پر پورا پورا صادق آ رہا تھا۔

"زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذلك متاع الحیوة الدنیا والله عنده حسن المآب"

کیا اس وقت اس منشور الٰہی کے نشر و اعلام کی ضرورت نہ تھی کہ

"انما الحیوة الدنیا لعب ولهو وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم"

کیا تاریخ اسلام کے ادوار میں سے اس دور سے زیادہ کوئی دور اس حقیقت کا مصداق ہو سکتا ہے کہ

"اعلموا انما الحیوة الدنیا لعب ولهو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراه مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرة عذاب شدید۔ ومغفرة من الله ورضوان وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور"

کیا دنیوی دل کشی سے مسحور اس سے زیادہ اور کوئی سماج ہو سکتا تھا جسے اس دنیائے دنی کی لذاتِ فانیہ کے فریب سے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

یا ایها الناس ان وعد الله حق فلا تغرنکم الحیوة الدنیا ولا یغرنکم بالله الغرور

لہٰذا وقت کے برگزیدہ نقیب اور داعی کا فرض تھا کہ وہ پکار کر کہہ دے۔

یا قوم انما هذه الحیوة الدنیا متاع وان الاخرة هی دار القرار

پس اُس نے انھیں مبہم الفاظ میں بتا دیا۔

بل تؤثرون الحیوة الدنیا والاخرة خیر وابقیٰ،

یہ بتانے والا امام غزالی تھا جس نے اسلامی سماج کی پانچویں صدی میں تجدید کی جب کہ معاشرہ میں رفق و لینت کے بجائے قساوت، احتساب باطن کے بجائے ظاہر پرستی، للّٰہیت